اجتہاد

اختلاف رائے اور ہمارے رویے

حسن الامین

اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں ہماری معلومات بس اس قدر تھیں، جتنی کہ سکول اور کالج کے زمانہ میں ہمیں مطالعہ پاکستان کی کسی درسی کتب میں دی جاتیں اور مجھے یقین ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود اس ادارے کے سربراہ نہ بنتے، تو ابھی تک ہماری معلومات میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہو پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں ہم بس اتنا جانتے تھے کہ یہ بھی پبلک سیکٹر میں قائم ایک آئینی ادارہ ہے، جس کا کام ریاستی قانون سازی کے حوالہ سے اسلام کی تعبیر وتشریح میں پارلیمنٹ کی مدد کرنا ہے۔ عملی طور پر ہم سمجھتے تھے (اور کچھ زیادہ غلط نہیں سمجھتے تھے) کہ یہ بس ایک ادارہ ہے، جیسے کہ اس نوعیت کے دوسرے ادارے ہوا کرتے ہیں مثلاً اسلامی کانفرنس کی تنظیم یا اکنامک کوآپریشن آرگنائیزیشن، جن کے نام اور کتابی اہداف تو لمبے چوڑے ہوتے ہیں لیکن عملی فائدہ کوئی زیادہ نہیں ہوتا۔ جس طرح ان دیگر اداروں کے بارے میں ہمیں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کو ملتے، بالکل یہی حال اسلامی نظریاتی کونسل کا بھی تھا اور یقیناً یہ نکتہ نظر ابھی تک جوں کا توں رہتا، اگر اس ادارے کے چند انقلابی اقدامات سے ہم واقف نہ ہو چکے ہوتے، اس کے اندر منعقد ہونے والی کئی علمی وفکری مباحثوں، گفتگوؤں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنسز میں شریک ہونے کا موقع نہ ملتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک جلیل القدر علمی شخصیت، جو ہمارے جیسے بنجر اور قحط الرجال کی حالت میں زندہ معاشرہ میں اگر نایاب نہیں، تو کمیاب ضرور ہیں، پروفیسر محمد خالد مسعود اس کے سربراہ نہ ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے اس ادارے کے کام اور دائرہ کار کو ایک نئی شناخت دی ہے، اب نظر آتا ہے کہ علمی، تحقیقی اور ملکی وملی مسائل پر سوچ و بچار کرنے والے ادارے محض شاندار عمارتوں سے نہیں بلکہ ان کے اندر ہونے والے تحقیقی کام اور جاری اکیڈمک پروجیکٹس سے بنتے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل اب ایک نئی شناخت، نئی سوچ اور ایک مختلف لائحہ عمل کے ساتھ ان مسائل کو موضوع بحث بنا رہی ہے، جن کا براہ راست تعلق ہمارے سماج کے ساتھ ہے اور یہ وہ مسائل ہیں، جن کو یا تو ہم مسائل ہی نہیں سمجھتے اور یا پھر کم اہم جان کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایسے کئی مسائل پر گذشتہ کچھ عرصہ میں کونسل کی جانب سے بڑی پیش رفت دیکھنے میں آئی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر میں کونسل کے اندر ہونے والی رونمائی کی ایک تقریب کا ذکر کروں گا، جس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک نئے جریدے ''اجتہاد'' اور مسلم خواتین کے مسائل پر عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی عالمی شہرت کی حامل کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' کے چار جلدوں پر مشتمل ترجمے کی رونمائی شامل تھی۔ ان دو وقیع کاموں کا تعارف تو میں اگلے کالم میں کروں گا، یہاں میں اس نشست کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو اس مجلّے اور ترجمے کے ضمن میں منعقد ہوئی۔ نوجوان اسکالر اور جریدے کے مہمان مدیر خورشید احمد صاحب ندیم نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ''بیسویں صدی میں جس شخصیت نے اجتہاد کے لیے بنیادی خطوط پر کام کیا وہ علامہ اقبال تھے۔ وہ خود کوئی مجتہد نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی تھے اور اس منصب سے انہوں نے میدان سیاست میں قائداعظم کا انتخاب کیا، تو فقہ کی تدوین نو کے لیے ان کی نگاہ انتخاب مولانا انور شاہ کشمیری پر پڑی''۔ انہوں نے بتایا کہ ''ایک معاشرہ کا تشخص اگر اسلامی ہے اور یہ ایک زندہ معاشرہ کے طور پر قائم رہنا چاہتا ہے، تو اجتہاد اس معاشرہ کے قیام اور بقا کے لیے لازم ہے اور اجتہاد کے بغیر کسی زندہ اور متحرک معاشرہ کا وجود ناممکن ہے''۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ علامہ اقبال ایک مجتہد نہیں تھے اور محض ایک فلسفی تھے، کیونکہ علامہ نے قیام پاکستان کا تصور دے کر ایک اجتہاد ہی کیا۔

> علمی، تحقیقی اور ملکی و ملی مسائل پر سوچ و بچار کرنے والے ادارے محض شاندار عمارتوں سے نہیں بلکہ ان کے اندر ہونے والے تحقیقی کام اور جاری اکیڈمک پروجیکٹس سے بنتے ہیں۔

اس تقریب میں جو واقعہ باعث تحریر بنا، وہ بعض شرکائے محفل کا وہ رویہ تھا، جو تحریک حقوق نسواں کی مشہور شخصیت محترمہ طاہرہ عبداللہ کی تقریر کے بعد سامنے آیا۔ محترمہ نے نسبتاً تند و تیز جملوں میں عصر حاضر کی مسلم خواتین کے ان مسائل کا ذکر کرنا چاہا، جو

بدقسمتی سے ہمارے اہل مذہب کے ہاں بہت کم زیر بحث آتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ آج کی مسلمان خاتون جن مسائل کا شکار ہے، وہ غربت، جہالت، عدم تحفظ، جسمانی اور جنسی تشدد، زندگی کے اہم امور میں فیصلہ کرتے وقت ان کی رائے نہ

> اسلامی نظریاتی کونسل اب ایک نئی شناخت، نئی سوچ اور ایک مختلف لائحہ عمل کے ساتھ ان مسائل کو موضوع بحث بنا رہی ہے۔

پوچھنا، زندگی کی بنیادی سہولیات تک رسائی کا فقدان وغیرہ ہیں، جب کہ مذہبی لوگ جب بھی عورت کا ذکر کرتے ہیں، تو وہ جنسی تسکین اور فحاشی وعریانی سے زیادہ نہیں کرتے۔ ان کی تقریر ختم ہوتے ہی کئی مرد حضرات اپنی نشستوں سے اٹھے اور شاید ان مسائل کا ذکر چھیڑنے سے اپنی "مردانگی" کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے جذباتی انداز میں ہال سے باہر نکلے۔ یہ ایک ایسا رویہ تھا جو نہ صرف یہ کہ غیر علمی تھا بلکہ ناشائستہ بھی تھا۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، یہ تحریک کے اصول پر قائم ہے اور اس میں تیزی سے بدلتے حالات اور واقعات روزانہ کے حساب سے نت نئے سوالات کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ اپنے وجود اور شناخت کے لحاظ سے متنبہ رہنے والے معاشرے تو اس بات کا غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں کہ وہ ان سوالات کے کافی وشافی جوابات فراہم کریں کیونکہ جو تہذیب تمدن اپنے سامنے اٹھنے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات فراہم نہیں کر سکتی، وہ فنا ہو جایا کرتی ہے، فکری خلجان اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے، اس کا وجود اور شناخت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لیکن جواب دینا تو درکنار، کیا ان سوالات کو اٹھانے کی بھی ہمت نہیں کرنی چاہئے؟ کیا محترمہ طاہرہ عبداللہ کے اٹھائے گئے سوالات کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا جائے کہ ایک خاتون کس طرح یہ جرأت کر سکتی ہے کہ وہ اتنے سارے مردوں کے سامنے ان سوالات کو اٹھائے؟

پہلے زمانے میں نت نئے موضوعات پر اجتہاد اور تحقیق کا یہ کام افراد اپنی انفرادی حیثیت میں ہی سرانجام دے سکتے تھے لیکن اب بالخصوص، صنعتیت (industrialization) کے عمل نے انسانی سماج کے لیے بہت سی پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے اور مغرب میں یہ کام جامعات اور غور وفکر کے اداروں (think tanks) نے سنبھال لیا ہے اور بہت بڑے پیمانے پر یہ کام بغیر کسی توقف کے جاری وساری رہتا ہے۔ بلاشک، اجتہاد اور تحقیق کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ، لیکن اس تقریب میں شرکت سے یہ احساس دامن گیر ہوا کہ نت نئے علمی سوالات کو سہنے اور شائستہ انداز میں اختلاف کرنے کا ہمارا سماجی رویہ بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، جس کا مشاہدہ ہم صبح وشام اپنے گردوپیش میں کر رہے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اجتہاد جب ہوگا تو ایک سے ایک نئی آراء سامنے آتی جائیں گی جن میں ظاہر ہے کچھ ایسی ہوں گی، جن سے قدیم، روایتی اور پہلے سے راسخ آراء پر شدید ضرب بھی پڑتی ہوگی، تو ہم اگر اس نئی رائے سے اتفاق نہیں کرتے تو کم از کم ہمارے اندر اس کو سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ تو ہونا چاہئے کیونکہ اجتہاد اور تحقیق کی روایت صرف ان معاشروں میں ہی پنپ سکتی ہے، جہاں اختلاف رائے کی آزادی کو ایک بنیادی قدر کے طور پر مان لیا جائے اور جہاں اپنی رائے کی غلطی کے احتمال کے ساتھ کسی اور کی رائے کو صحیح ماننے کا جذبہ بھی موجود ہو۔ اہل مذہب کے عدم برداشت کی مثال لیں، تو ہم نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسی گراں قدر علمی شخصیت کو امریکہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور "خاکی بھائیوں" کا طرز عمل دیکھیں تو ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کو اپنی کتاب "Military Inco." کی رونمائی کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اس کے بعد ان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے!! تحقیق اور اجتہاد کی بات تو بعد میں کریں، پہلے عدم برداشت جیسے سماجی رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کو بدلنے میں سب سے مؤثر لوگ اگر کوئی ہو سکتے ہیں تو وہ علماء کرام ہی ہیں۔

(روزنامہ مشرق، ۴ اگست ۲۰۰۷)

اسلامی نظریاتی کونسل
چند نئے امکانات

حسن الامین

جیسا کہ گذشتہ کالم میں ذکر ہو چکا کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی قیادت میں اسلامی نظریاتی کونسل نے کئی ایک نئی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے، جن کو آئین اور قانون جیسے فنی موضوعات کے بیچ کام کرنے والے ادارے کی خشک فضاؤں میں تازہ ہوا کا نیا جھونکا قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ کئی دہائیوں سے محض روایت کے بندھنوں میں مقید اس کونسل کی جانب سے دو نئی تخلیقات سامنے آئیں ہیں: ایک تو سہ ماہی جریدہ "اجتہاد" کا اجراء ہے، جس کا جون کا شمارہ چھپ کر آ چکا ہے اور دوسرا، مسلم خواتین کے مسائل پر عربی میں چھپنے والی عبدالحلیم محمد ابوشقہ کی شہرہ آفاق کتاب "تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ" کے چار جلدوں پر مشتمل ترجمے کی اشاعت ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے جن تین محققین نے اس کتاب کو عربی سے آسان اور سلیس اردو میں ترجمہ کیا، وہ جناب محمد خالد سیف، جناب ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد اور جناب انعام اللہ ہیں۔ یہ بلاشبہ، اپنے موضوع پر ایک غیر معمولی کتاب ہے، جو حقوق نسواں کے حوالہ سے ہمارے معاشرے میں موجود دونوں انتہا پسندانہ نکتہ ہائے نظر کے درمیان اعتدال قائم کرتی ہے اور ایک پل کا کام دیتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے اعتراضات کا کافی حد تک جواب دیتی ہے جن کے خیال میں اسلام میں خواتین کو مردوں کی غلامی